بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

اللہ اکبر! قدرت کی کرشمہ سازیاں بھی کس قدر عجیب وغریب اور حیرت انگیز ہیں کہ جس طرح عقلِ انسانی ان کی گرہ کشائی سے آج سے صدیوں پہلے عہدِ جاہلیت میں عاجز و درماندہ تھی۔ آج جبکہ اس نے فطرت کے اسرار و رموز کو اپنے پنجۂ تدبیر سے بڑی حد تک بر افگندۂ نقاب کر دیا ہے۔ ایسی ہی عاجز و بے بس ہے۔

غور کیجئے تو تاریخ نے گذشتہ چند دنوں کی ایک کروٹ میں ہی انقلاب و تغیر کی ایسی دور دراز منزلیں طے کر لی ہیں جو صدیوں میں بھی طے نہیں ہوئیں۔ اور اس مختصر مدت میں دنیا کے پردۂ وجود پر ان واقعات و حوادث نے ظہور کیا ہے جو قرنوں میں بھی ظاہر نہیں ہوتے۔ سوچنے اور سمجھنے والوں کے لئے ان واقعات و حوادث کی کتاب کا ایک ایک صفحہ۔ اور اس صفحہ کی ایک ایک سطر عبرت و بصیرت کی ہزاروں داستانیں سنا رہی ہے۔ اور انسانی قلب و دماغ کو ایک مسلسل مگر پائیدار درسِ نصیحت و موعظت دے رہی ہے۔ فہل من مدّکر۔

کون نہیں جانتا چند ہی مہینوں کی بات ہے۔ موجودہ دنیا کی وہ عظیم ترین شخصیت جس کو لوگ پریسیڈنٹ روزولٹ کے نام سے جانتے تھے اور جس کے دبدبۂ و شوکت کا یہ عالم تھا کہ اس کی چشمِ کرم و التفات کی ایک جنبش نے برطانیہ عظمیٰ کی بدنصیبی کو خوش نصیبی سے اور مایوسی و ناکامی کو فتحمندی و کامرانی سے بدل دیا تھا۔ بالآخر جب قدرت کے محکمۂ قضا سے خود اس کے لئے فرمانِ اجل صادر ہوا تو ذرا بھی دیر نہ لگی اور وہ دم کے دم میں موت کا شکار ہو گیا۔ فیشسٹ نظامِ حکومت کا وہ عفریت قہر سامان (مسولینی) جس کے کام و دہن سے نکلا ہوا

ایک ایک سانس عالم کے کارخانۂ امن وامان میں ہلچل پیدا کردیتا تھا۔ آخر کار اس کا حشر یہ ہوا کہ وہ خود اپنے ہی ملک کی سرزمین پر خود اپنی ہی فوج کے سپاہیوں کے ہاتھوں انتہائی بے بسی وبے کسی کے عالم میں اپنی داشتہ کے ساتھ بندوق کی گولیوں کی مسلسل بوچھار کا نشانہ بنا اور اس طرح وہ ہمیشہ کے لئے خاکِ مذلت ورسوائی کا پیوند ہو کر رہ گیا۔

عصرِ حاضر کا وہ مجموعۂ طلسمات وعجائبات انسان (ہٹلر) جس کا قدم قدم مادرِ گیتی کے بدن پر خوف وہراس کی لہریں پیدا کردیتا تھا اور جس کے کالبدِ عزم وہمت کی ایک ایک کروٹ سے ملکوں اور قوموں کی قسمتوں کے نقشے بدل جاتے تھے۔ انجام کار دنیا نے دیکھا کہ وہ خود اپنے کاشانۂ امارت وعشرت کی ہی دیوار کے سایہ میں اپنی محبوبہ کے ساتھ اس دردانگیز طریقہ پر نذرِ اجل ہوا کہ آج اس کا کہیں ایسا نام ونشان بھی نہیں ہے جہاں کوئی نوحہ وماتم کے دو آنسو بھی گرا سکے۔"

یہ تو جو کچھ ہوا شخصی عروج وزوال کا ایک عبرت انگیز مرقع تھا۔ اس سے قطع نظر قومی اعتبار سے دیکھئے تو نظر آئے گا کہ جو قوم کل تک اپنے ہر منصوبہ میں کامیاب اور اپنے ہر ارادہ میں فتحمند وکامران تھی۔ اور جس کے جلو میں اقبال ونصرت کی فوجیں جوق در جوق چلتی تھیں۔ گردشِ ایام کی ایک جنبش نے ہی اب اسے "نوائے سوختہ در گلو" کا ایک حیرت افزا پیکر بنا کر رکھ دیا ہے۔ اور ابھی کچھ دن ہوئے ان کی بدقسمتی پر دنیا کے تین بڑے انسانوں نے اپنے متفقہ فیصلہ سے ایک حتمی مہرِ تصدیق بھی ثبت کردی ہے۔

اور اس کے برعکس جو قومیں میدان پر میدان چھوڑتی چلی جارہی تھیں اور دنیا کی انگشت قیافہ شناسی جن کے نبضِ حیات کی مدہم رفتار کا بے چینی سے شمار کر رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے انھوں نے پوری جنگ کا نقشہ یکسر منقلب کرکے رکھ دیا۔ چنانچہ آج فتح کا جھنڈا انھیں کے ہاتھوں میں لہرا رہا ہے اور ظفرمندی کا تاجِ زرفشاں ان کے سروں کی زینت بنا ہوا ہے

تاریخ کے صفحات قوموں کے عروج وزوال کی داستانوں سے تہی مایہ نہیں۔ لیکن آپ کو جستجو کے بعد بھی ان میں کسی ایک ایسی قوم کا حال نہیں ملیگا کہ جس نے کل بارہ سال کی مدت میں انتہائی عروج اور پھر اسی طرح انتہائی زوال دونوں کی منزلوں کو اس سرعت کے ساتھ طے کرلیا ہو۔ اور وہ چند ہی دنوں میں سب کچھ بن جانے کے بعد یکایک پھر کچھ بھی نہ رہی ہو۔

یہ قوموں کی شکست وریخت اور ان کا یہ عروج وزوال خواہ کتنا ہی درس آموز و عبرت انگیز ہو۔ لیکن ایک سنجیدہ مفکر کے لئے سب سے زیادہ لائق توجہ وہ خاموش انقلاب ہے جو ابھی حال میں انگلستان کے جدید انتخاب سے بطور نتیجہ پیدا ہوا ہے۔ غور کیجئے انگلستان کا سابق وزیرِ اعظم جس نے درحقیقت اپنی قوم کے حق میں مسیحا کا کام کیا۔ آج وہ خود اپنی اسی قوم کے ہاتھوں گمنامی اور بے چارگی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا گیا ہے اور اس طرح جہاں اہلِ برطانیہ نے اپنی آزاد خیالی۔ روشن ضمیری اور عالی دماغی کا ایک ناقابلِ تردید ثبوت پیش کیا ہے۔ انھوں نے قطعی طور پر یہ حقیقت بھی ثابت کر دی ہے کہ اب معاشی اور سیاسی رجحانات کے اعتبار سے دنیا کا رُخ کیا ہے؟ اور خارجی وداخلی عوامل ومؤثرات نے اسے کس طرف چلنے پر مجبور کر دیا ہے۔ جنگِ یورپ کے اختتام پر جارج برناڈ شا نے کہا تھا کہ یہ فتح دراصل انگلینڈ والوں کی نہیں بلکہ سوویٹ روس کی فتح ہے۔ اس بنا پر ہمیں اس پر خوشی منانے کا کوئی حق نہیں ہے۔" یورپ کے اس جہاندیدہ بوڑھے نے ڈھائی مہینہ پہلے جو بات کہی تھی انگلستان کے گذشتہ انتخابات نے اسکی حرفاً حرفاً تصدیق کر دی ہے۔ اور برناڈ شا غریب نے تو جنگ کا سارا کھیل دیکھ لینے کے بعد یہ کہا مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم جنگ کے آغاز میں ہی اس نتیجہ کی پیش گوئی کر چکے تھے۔ جس کی شہادت آج بھی بڑے بڑے علمائے کرام دے سکتے ہیں۔

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس عظیم وجلیل انقلاب کا اثر صرف انسان کی سیاسی اور معاشی

بدگی تک ہی محدود نہ رہیگا۔ بلکہ مذہب اور اخلاق کا بھی اس سے متاثر ہونا ناگزیر ہے۔ اس وقت
یا ایک بالکل نئے سانچہ میں ڈھل رہی ہے۔ پرانے افکار و خیالات کی جگہ نئے رجحانات و میلانات
پکڑ رہے ہیں۔ زندگی کی نسبت ایک بالکل جدید نقطہ نظر بڑی تیزی سے پرورش پا رہا ہے۔ روحانی اور
علاقی و مذہبی اقدار روز بروز بے وزن و بے قیمت ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ انسان
شرف المخلوقات ہونے کے باوصف قطعی طور پر ایک معاشی حیوان بن رہا ہے اور وہ ان تمام
چیزوں کو یکسر نظر انداز کرتا جا رہا ہے جن کا تعلق انسانی روح کے ارتقا اور اس کے باطن کی
فوز و فلاح سے ہے، پھر چونکہ اس نقطۂ نظر کی پشت پر بے پناہ فوجیں اور حکومت و سلطنت
کی نہایت مستحکم طاقت و قوت ہے۔ اس بنا پر اس معاشی اور مادی نقطۂ نظر کے تمام دنیا پر چھا
جانے کے جو قوی امکانات ہیں ان سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔

حکومت کی ساحری کس طرح محکوم کے احساس اور اس کی قوتِ امتیاز کو ماؤف و معطل
کر دیتی ہے۔ اس کی ایک تازہ مگر دلچسپ مثال یہ ہے کہ انگلینڈ میں لیبر پارٹی کے برسرِ اقتدار آتے
ہی ہماری ایک مشہور قومی درس گاہ کے وائس چانسلر نے جس کا بند بند سرمایہ داری کی زنجیروں میں
جکڑا ہوا ہے۔ پارٹی کے لیڈر کو مبارکباد کا تار بھیجا ہے اور اس میں بڑے فخر سے اس کا اظہار کیا
ہے کہ "سوشلزم اسلام سے بہت قریب ہے" گویا اسلام موم کا ایک ایسا مجسمہ ہے کہ اسے جو شکل
آپ چاہیں بڑی آسانی سے دے سکتے ہیں۔

ان حالات میں لامحالہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نئے نظامِ عالم کے نقشہ میں مذہب کی
کیا حیثیت ہوگی اور اس کے خانہ کو کس طرح پُر کیا جا سکتا ہے واقعہ یہ ہے کہ اگر اسلام واقعی دنیا کا
آخری اور سچا مذہب ہے تو اس سوال کا جواب سب سے پہلے مسلمانوں کو دینا چاہئے اور انھیں غور کرنا
چاہئے کہ وہ اس سیلاب کا مقابلہ کیونکر اور کس طرح کر سکتے ہیں۔ ورنہ اگر اس نازک وقت پر بھی

انھوں نے اپنی غفلت اور بے حسی کو نہیں چھوڑا تو نہیں کہا جا سکتا کہ خدا کی اس وسیع سرزمین
انھیں کہیں کوئی ایسا گوشۂ عافیت مل بھی سکے گا یا نہیں جہاں وہ اطمینان سے زندگی کا سانس لے

انسانی تہذیب و تمدن میں جب کبھی کوئی عظیم انقلاب رونما ہوتا ہے تو عموماً اس کی
پر دو چیزوں کی طاقت و قوت ہوتی ہے ایک قلم اور دوسری تلوار۔ مفکرین اپنی تحریروں
شاعر اپنی شعلہ نوائیوں سے۔ اور آتش بیان مقرر اپنی تقریروں سے لوگوں کے افکار و خیالا
میں ایک بحران و تموج پیدا کر کے انھیں کسی ایک خاص فکر سے اس طرح وابستہ کر دیتے ہیں کہ
فکر ان کی روح میں تحلیل ہو کر ان کا ایمان اور عقیدہ بن جاتا ہے۔ پھر جب ان میں یہ جذبہ پیدا ہ
ہے کہ وہ اس عقیدہ کی صداقت کو دوسروں پر ظاہر کریں اور ان سے اس کی عظمت و برتر
کا اقرار کرائیں تو اب اس قوم کے سپاہی میدانِ عمل میں آتے ہیں اور جو کام قلم سے تشنۂ تکمی
رہ گیا تھا وہ اسے مکمل کر دکھاتے ہیں۔ آج کی دنیا میں بھی دیکھئے تو یہی دو طاقتیں کام کر رہی ہ
اور انھیں کی موافقت اور عدم موافقت سے قومیں گر رہی اور ابھر رہی ہیں، یہ ایک ایسی کھلی حقیق
ہے جس سے انکار نہیں ہو سکتا۔

پس مسلمانوں کے لئے دین کی حفاظت کا صرف یہی ایک موثر طریقہ ہو سکتا ہے کہ وہ ایک
طرف قلم کے زور سے موجودہ مذہب کش رجحانات و مزعومات کا رخ پلٹنے کی کوشش کریں
اور دوسری جانب وہ اس کی سعی کریں کہ دنیا میں طاقت و قوت کے جو چند دائرے بن رہے ہیں
ان میں سے کسی ایک دائرہ میں ان کو بھی کوئی وقیع مقام حاصل ہو۔ قلم اور تلوار کی طاقت دونوں
ایسے لازم و ملزوم ہیں کہ کسی ایک کو دوسرے پر تقدم نہیں دیا جا سکتا۔ تلوار کی طاقت کا حصول
بغیر کسی فکرِ صحیح کے سراسر گمراہی ہے اور فکرِ صحیح بغیر تلوار کی طاقت کے محض ایک فلسفہ ہے
مذہب نہیں ہے۔ لسان العصر مرحوم نے خوب کہا ہے۔

نہ ہو مذہب میں گر زورِ حکومت   تو وہ مذہب نہیں ایک فلسفہ ہے

مرحوم کے شاعرِ حکیم نے اسی حقیقت کو اس طرح بیان کیا ہے۔

ایں نکتہ کشائندہ اسرارِ نہانست   ملکست تنِ خاکی و دیں روح روانست

تن زندہ و جاں زندہ زربطِ تن و جانست   باسبحہ و سجادہ و شمشیر و سناں خیز

از خوابِ گراں خوابِ گراں خوابِ گراں خیز

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے عہدِ عروج و ترقی میں سبحہ و سجادہ اور شمشیر و سنان دونوں کا تعاون اور اشتراک ہی اس بات کا ضامن رہا ہے کہ انہوں نے جب کبھی کسی کو فتح کیا تو . . . . نے مملکت کے ساتھ ساتھ اہلِ ملک کے دل اور دماغ اور ان کی ح کو بھی فتح کرلیا۔

آج مسلمانوں کی اپنی تبلیغیں اور اصلاحی انجمنیں بھی ہیں اور قومی تعلیمی درسگاہیں بھی، ان میں بھی ہیں اور انشا پرداز بھی۔ سیاسی رہنما بھی ہیں اور دینی پیشوا بھی۔ لیکن افسوس ہے کہ مجموعی طور ری ان تمام کوششوں کا رخ ایسا نہیں ہے جس سے ہم دنیا کے بین الاقوامی حالات کا مقابلہ کرسکیں س طوفان سے بچ سکیں جس کے یکایک امنڈ پڑنے کا امکان اب قوی تر ہوگیا ہے۔

ہماری ایک بڑی غلطی یہ رہی ہے کہ اب تک ہم نے جتنے کام کیے ہیں وہ صرف اپنی ود اور بالکل قریب کی دنیا کو پیشِ نظر رکھکر کیے ہیں۔ حالانکہ ہمیں سمجھنا چاہیے تھا کہ اب دنیا اپنی وسعتوں کے باوجود ایک خاندان یا ایک قبیلہ بن کر رہ گئی ہے۔ اس بنا پر یورپ میں جو انقلاب پیدا اس سے ایشیا، اور افریقہ کا متاثر ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح چین و جاپان اور ہندوستان کی ی صورتِ حال کا اثر ضروری ہے کہ یورپ اور امریکہ پر پڑے۔ جس انقلاب کا اندیشہ تھا اب بظاہر کے پھیل پڑنے کا وقت قریب آگیا ہے اور ہم اب تک اس قابل بھی نہیں کہ چند لمحے اس سیلاب کی

موجوں سے برسرِ آویزش ہی رہ سکیں۔ جو انقلاب اب آرہا ہے خود ہمارے ملک میں برسوں سے اس کی
زمین ہموار کی جاتی رہی ہے اور شدید ترین پروپیگنڈہ کے ذریعہ نوجوانوں کے دماغوں کو اس طرح
کرلیا گیا ہے کہ یہ انقلاب ہندوستان میں پہنچکر غالباً کوئی اجنبیت محسوس نہ کرے گا۔ بلکہ یہاں
درو دیوار سے اس کے خیر مقدم کی آوازیں بلند ہوں گی۔ اس کے علاوہ اگر یہ صورت نہ بھی ہوتی تو ہند
غریب تو یوں بھی غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے اس بنا پر ہر وہ نظام، ہر وہ فکر، اور ہر وہ تہذ
جو یورپ کی طرف سے آئیگی وہ لامحالہ اسے قبول کرے گا اور ضرور قبول کریگا۔ آپ زبان سے لاکھ چیخیں
چلائیں، شور مچائیں اور واویلا کریں وقت کا کارواں جس رفتار سے چل رہا ہے اور اسے فطرت کی جو
آگے بڑھا رہی ہیں ان کے زور شور اور ذوقِ تیز گامی و سبک پائی میں کوئی فرق پیدا نہیں ہو سکتا۔ کچھ
بہت توقع ان حکومتوں سے ہو سکتی تھی جو مسلمان کہلاتی ہیں لیکن وہ تو ہم سے بھی زیادہ خستہ تیغ
ہیں۔ اور انقلاب پذیری کی استعداد میں ہم تیرہ بختانِ ہند سے بھی کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر ہیں غ
یہ ہی وہ دنیا کا جدید رخ تھا جسے حکیمِ مشرق کی چشمِ غیب آشنا نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا اور اس
بڑے درد اور سوز و گداز سے کہا تھا۔

انکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

اب آپ پوچھیں گے کہ اچھا! جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔ اب اس کا علاج کیا ہے؟ ہمارے نزدیک
موجودہ حالات میں اس کی تدبیر کے تین اجزا ہیں اور ان میں سے ہر ایک چیز بجائے خود ایک مستقل اہم
رکھتا ہے۔ ایک یہ کہ ہندوستان کے تعلیمی نظام پر زیادہ سے زیادہ اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کی
یعنی سعی اس بات کی ہونی چاہئے کہ کم از کم مسلمانوں کا نظامِ تعلیم بالکل الگ ہو اور وہ ایسے اجزا
مرکب ہو کہ اس تعلیم کو حاصل کرنے کے بعد ہماری قوم کے نونہال جہاں بہترین انجنیر، صناع، ارباب
اور علومِ جدیدہ کے ماہر ہوں۔ ساتھ ہی وہ سچے اور پکے مسلمان ہوں اسلامی تہذیب کے دلدادہ ہوں
دینی حمیت کے پیکر ہوں اور اس طرح وہ دینی اور دنیوی دونوں قسم کی سعادتوں اور بھلائیوں سے

جامع ہوں۔ دوسری چیز یہ ہے کہ ہم میں ایسے اربابِ قلم اور ایسے فنی ماہر مقرر ہونے چاہئیں جو یورپ اور ایشیا کی مختلف زبانوں میں تحریر اور تقریر کی پوری استعداد و صلاحیت رکھتے ہوں۔ اور ساتھ ہی اسلامی علوم و فنون کے فاضل و مبصر ہوں۔ اس قسم کے حضرات کافی تعداد میں ہندوستان سے باہر جاکر یورپ اور ایشیا میں پھیل جائیں اور مختلف ملکوں میں اپنے ادارے قائم کرکے اسلام کی تبلیغ کا کام کریں، اُن زبانوں میں اسلام پر کتابیں لکھیں اخبارات اور رسالے شائع کریں۔ پبلک اجتماعات کے موقعوں پر تقریریں کریں۔ غرض یہ ہے کہ تبلیغ و اشاعت کے جتنے طریقے ہیں انھیں کام میں لائیں۔ یہ خوب یاد رکھنا چاہیے کہ اگر اس طرح آپ نے کسی ایک آزاد ملک کے سمجھدار اور با اثر غیر مسلم کو مسلمان کرلیا تو وہ یہاں ہندوستان کے پچاس چھوتوں کے مسلمان کرلینے سے زیادہ نافع اور مفید ہے پھر ان غیر ملکی مبلغوں کا ایک طبقہ ایسا بھی ہونا چاہیے جو ٹرکی، مصر، ایران، افغانستان اور عراق و فلسطین اور روس کی مسلمان جمہوریتوں میں اسلامی احکام و مسائل کی نشر و اشاعت کرے، اُن کو حقیقی اسلام کی لذت کا متوالا اور والہ و شیدا بنائے۔

غور کیجئے۔ اگر آپ کی ان کوششوں سے کچھ اور نہیں فقط ٹرکی کی پارلیمنٹ کے ارکان اور مصر کے کابینہ وزارت کے عمائد ہی سچے اور پکے مسلمان بنجاتے ہیں تو وہ کیا کچھ نہیں کرسکتے اور ان سے اسلام کو جیسی کچھ تقویت نہیں پہنچ سکتی۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں بحمداللہ تبلیغ کے ولولہ و جوش کی کمی نہیں ہے لیکن افسوس ہے کہ ان کی کوششوں سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ اس لئے پیدا نہیں ہوتا کہ وہ یہ نہیں جانتے کہ تبلیغ اولاً کس قوم میں اور کن لوگوں میں کرنی چاہیے۔ کس طرح کرنی چاہیے۔ اور کن لوگوں کو اس کے لئے کس طرح تیار کرنا چاہیے۔ اگر مسلمان اس ضرورت کو پیشِ نظر رکھکر کام کررہے ہوتے تو آج یہ ناممکن تھا کہ دنیا کے مختلف حصوں میں مختلف سیاسی پارٹیاں قائم ہوتیں اور اسلامی دستور و آئین کی حامی کوئی ایک پارٹی بھی نہ ہوتی۔

تیسری چیز یہ ہے کہ مسلمانوں کو ملک کے سیاسی اقتدار میں زیادہ سے زیادہ شریک ہونے کے لئے جدوجہد کرنی چاہیے۔ اور جتنا حصہ بھی ملے اور جب بھی ملے اس سے بہرحال انھیں فائدہ

اٹھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہم دیکھتے ہیں اگر ایک وزیر تعلیم کام کا آجاتا ہے تو وہ محکمۂ تعلیمات
کیا کر دیتا ہے۔ کسی یونیورسٹی کا ایک وائس چانسلر اگر صحیح الخیال اور عملی آدمی ہو تو وہ یونیورسٹی کے
اصلاح کر کے اسے کس قدر مفید اور سود مند بنا سکتا ہے۔ مسلمانوں کی یہ پالیسی کہ "یا کھائیں گے
ورنہ جائیں گے جی سے" انھیں سخت نقصان پہنچا رہی ہے اور وہ نہیں سمجھتے کہ اس وقت
کی سیاسی طاقت میں ان کی صحیح نمائندگی کے نہ ہونے سے انھیں قومی اور جماعتی طور پر کس
نقصانات پہنچ رہے ہیں اور آئندہ اور کس قدر زیادہ نقصانات پہنچ سکتے ہیں۔

یہ جو کچھ ہم نے عرض کیا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ مقصد صرف اس طرف توجہ دلانا
یہ عرض کرنا ہے کہ اگر واقعی آپ اسلام کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں اور مسلمانوں کی جماعتی اور قو
کو باعزت طریقہ پر قائم و باقی رکھنے کے آرزو مند ہیں تو خدا کے لئے وسعتِ نظر، بیدار مغزی
سے کام لیجئے اور جو کام کرنے کے ہیں انھیں اس طرح کیجئے جس طرح کہ انھیں کرنا چاہیے۔ و
امام مہدیؑ کی آمد کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہنے سے کوئی کام نہ ہو سکیگا اور
کے سامنے مسئولیت سے نہ بچ سکیں گے۔

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

حضرت مولانا قاری محمد اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ

گذشتہ مہینہ کے برہان میں حضرت مولانا شاہ قاری محمد اسحٰق صاحب رحمۃ اللہ عل
وفات حسرت آیات کی خبر شائع کی جا چکی ہے۔ لیکن چونکہ پرچہ کی پوری کتابت ہو چکی تھی اس
شذرہ نہیں لکھا جا سکا۔ حضرت مرحوم دہلی کے باشندہ تھے۔ آپ کے والد ماجد مولانا قاری ر
مولانا شاہ عبدالغنی صاحب محدث دہلوی کے خلیفہ تھے اور فنِ تجوید و قرأت میں بڑا کمال